© rasailojaraid.com

نظرات

النبأ العظیم

(۱۴)

بہرحال جو مسلمان کوئی کاروبار کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں ان کو یقین رکھنا چاہئے کہ ان کا یہ وسیلۂ معیشت صرف ایک دنیوی کام نہیں ہے بلکہ خالص دینی اور عبادتی بھی ہے۔ اس بنا پر اسلام کا تقاضا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انہماک، دلچسپی اور شوق و توجہ سے اسے کریں۔ ایمانداری اور دیانت کو اپنا شعار بنائیں اور اس کو ترقی دینے کے لئے جن جدید طریقوں اور ٹکنک کی ضرورت ہے۔ ان کو حاصل کریں اور کوشش کریں کہ اس راہ میں بھی ان کے قدم پیچھے نہ رہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی کاروبار یا تجارت بغیر کثیر سرمایہ کے نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ خیال سرتاسر غلط ہے۔ میں کلکتہ میں ایسے متعدد حضرات سے واقف ہوں جو نہایت غریبی کے عالم میں کلکتہ آئے اور آج خدا کے فضل و کرم سے اپنی محنت اور لیاقت کے بدولت لکھ پتی بنے بیٹھے ہیں۔ ملک کی آزادی نے کسب معاش کے سینکڑوں ہزاروں ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ برادران وطن ان سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ان سے مستفید نہ ہوں۔ تقسیم کے وقت مغربی پاکستان سے لاکھوں شرنارتھی کس عالم میں یہاں آئے تھے لیکن آج ان کا کیا عالم ہے! ہر کاروبار اور ہر بزنس پر چھائے ہوئے ہیں اور ویرانوں کو نہایت پر شکوہ اور بارونق آبادیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اردو کا حال تو مجھے معلوم نہیں البتہ انگریزی زبان میں متعدد ضخیم اور مفید کتابیں ہیں جن میں چھوٹے بڑے کاروبار کی قسمیں اور ان کو کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں مثلاً NEW SMALL INDUSTRIES کے نام سے ۴۶۴ صفحات کی ایک کتاب ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن میں ایسے چھوٹے چھوٹے کاروباروں کے متعلق معلومات درج ہیں جو تین سو سے لے کر ایک ہزار روپیہ تک سے شروع کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کتاب LATEST COTTAGE INDUSTRY کے نام سے ہے یہ ایک ہزار سے اوپر صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چھوٹی بڑی سب صنعتوں کے متعلق نہایت مفصل اور کارآمد معلومات ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ تقریباً ہر شہر میں سرکاری یا غیر سرکاری پولی ٹکنک قسم کے انسٹی ٹیوٹ کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں مختلف قسم کی صنعتوں، دست کاریوں اور کاریگریوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں کاریگر بہت اچھے اچھے ہیں۔ مثلاً آگرہ میں جوتہ بنانیوالے فیروز آباد میں چوڑیاں، اور مراد آباد میں برتنوں پہ پالش اور نکل کا کام کرنے والے۔ لیکن چونکہ ان میں کارخانہ دار کم ہیں۔ اس لئے عملاً ہو یہ رہا ہے کہ محنت اور ہنر مسلمان کا اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ دوسروں کا۔ یہ گویا وہی بات ہو گئی جو علامہ اقبال مرحوم نے کشمیر کے بدنصیب مسلمانوں کی نسبت کہی تھی

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او — نصیب تنش جامۂ تار تارے [1]

بہرحال مسلمانوں میں چونکہ غالب اکثریت غریبوں اور قلیل المعاش لوگوں کی ہے۔ اس بنا پہ اگر پوری قوم کو معاشی اعتبار سے اوپر اٹھانا ہے تو اس کام کی تکمیل مسلمان سرمایہ داروں کے اشتراک و تعاون کے بغیر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ جگہ جگہ کواپریٹو سوسائیٹیاں۔ اور کواپریٹو بینک قائم ہوں۔ کمپنیاں، فیکٹریاں اور کارخانے کھولے جائیں اور امداد باہمی کے کاموں کی باقاعدہ اور وسیع پیمانے پر تنظیم کی جائے۔ خود مسلمانوں کے بعض تجارت پیشہ فرقوں مثلاً میمن اور بوہروں وغیرہم نے اس سلسلہ میں جو تجربات کئے ہیں ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

فرض کیجیے آپ کسی بڑے نامی گرامی باپ کے بیٹے ہیں اور آپ کو اس نسبت کا پاس اور لحاظ

---

[1] اسی طرح کسی اردو شاعر نے کہا ہے:

ساغر اُن کا ساقی اُن کا — آنکھیں میری باقی اُن کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ہے اور آپ اپنے بھائی کو فقر و افلاس کی حالت میں کسی معمولی سے ہوٹل میں برتنوں کے دھونے کی نوکری کرتے ہوئے دیکھیں تو کیا آپ کو صدمہ نہیں ہوگا اور آپ اس کی امداد نہیں کریں گے ؟ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے احساسات کیا ہیں۔ یقین کیجئے میرا اپنا حال تو یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر کسی بوڑھے مسلمان قلی کو سر کے اوپر بھاری بھاری بکس رکھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیکھتا ہوں یا میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کوئی مسلمان رکشا چلاتا نظر آتا ہے تو دل پر ایک تیر سا لگتا ہے کہ ہائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والا اور اس درجہ زبوں حال، حضور پرنور تو شہنشاہِ کونین بھی ہیں اور ہمارے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہم سے قریب بھی۔

"میرے دل پر تیر سا ضرور لگتا ہے اور میں تڑپ اٹھتا ہوں لیکن جب معاشرہ فاسد اور اس درجہ ناہموار ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ بہر حال اگر اس کی مزدوری ایک روپیہ ہوتی ہے تو میں دو روپیہ دے کر اس رنج والم کی تلافی کی کوشش کرتا ہوں۔"

کہتے ہیں ایک مرتبہ امیر معاویہ اپنی خلافت کے زمانہ میں عمرو بن العاص اور ابو الدرداء (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ جو ان کے بے تکلف دوست تھے بیٹھے ہوئے تھے اور بے تکلفی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں ان تینوں میں یہ طے پایا کہ اس وقت جس کے دل میں دنیوی لذتوں و نعمتوں میں سے جس نعمت و لذت کی زیادہ خواہش ہو اسے فوراً بلا سوچے سمجھے بیان کر دے۔ چنانچہ امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص نے اپنی اپنی جو خواہشیں بیان کیں وہ کھانے پینے۔ سیر و تفریح اور صحبت و ہم نشینی احباب سے متعلق تھیں لیکن جب حضرت ابو الدرداء کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا: "میری یہ تمنا ہے کہ خدا مجھ کو اتنی دولت دے کہ میں اس کو تقسیم کروں تو مسلمانوں میں ایک شخص بھی غریب نہ رہے"۔ امیر معاویہ یہ سن کر اچھل پڑے کہ جیسے کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو اور وہ بولے "ارے ابو الدرداء کیا غضب کرتے ہو! میں مسلمانوں کا خلیفہ ہوں اس لئے یہ تمنا تو مجھے کرنی چاہئے تھی تم اسے کیسے لے اڑے"۔ ابو الدرداء نے جواب دیا "ہاں امیر المومنین آپ نے بجا فرمایا لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ آپ نے نہیں کی اور "السبق للمتقدم" اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ صحابہ کرام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جو حضرات دولت کماتے یا اس کی تمنا کرتے تھے تو کیوں کرتے تھے اور ان کا مقصد اور مطمح نظر کیا ہوتا تھا حضرت عمرو بن العاص کا مقولہ ہے "اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کی دولت میں اتنے حقوق لگا دیئے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو ادا کرے تو خواہ کتنا ہی بڑا مالدار ہو۔ اس کے پاس افراطِ زر نہیں ہو سکتا" ایک صاحب نے سنایا: ایک مرتبہ مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری جن کے جنیدِ وقت اور شبلی زمانہ ہونے میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ ان کی خدمت میں کوئی شخص آیا اور عرض کی: "حضرت! میرے لئے دعا فرمایئے۔ میں حج کو جا رہا ہوں" آپ نے پوچھا "بھئی کیسا حج؟ پارسال تو تم ہو ہی آئے ہو" یہ شخص بولا "جی حضرت! اب میں حج نفل کے لئے جا رہا ہوں" یہ سننا تھا کہ حضرت رائے پوری برہم ہو گئے۔ اور غصہ کے لہجہ میں فرمایا "کیا اب کوئی مسلمان غریب نہیں رہا جس کا حق تم پر واجب ہو اور جس کی ادائیگی نوافل پر مقدم ہو"

پھر حقوق کی ادائیگی کی صورتیں مختلف اور گوناگوں ہوتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک شخص بھوکا ہے آپ نے اس کو کھانا کھلا دیا۔ وہ ننگا ہے آپ نے اس کے لئے کپڑے بنوا دیئے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ آپ ایک غریب انسان کی مدد اس طرح کریں کہ وہ اپنے لئے کوئی مستقل ذریعہ معاش پیدا کر سکے۔ ظاہر ہے یہ صورت نہایت ٹھوس، بے حد مفید اور نفع بخش ہے۔ اس کا فائدہ تنہا ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری قوم اور ملت کو پہنچتا ہے۔ کارخانے فیکٹریاں اور ملیں قائم کرنا، اسکول اور کالج بنانا۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں اور بنک قائم کرنا۔ یہ سب اسی دوسری صورت میں داخل ہیں اور انہیں چیزوں سے قوم کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مجاہدہ بالمال کو بھی سچے ایمان کی علامت اور نشانی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

(الحجرات)

بس سچے مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں پھر ان کے دل میں کوئی دغدغہ بھی پیدا نہیں ہوتا اور وہ اللہ کے رستہ میں اپنے مال اور جان کی بازی لگا دیتے ہیں یہی لوگ درحقیقت (دعوی ایمان میں) سچے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیت میں یا اور جہاں کہیں بھی "سبیل اللہ" کا لفظ آیا ہے اس کو جہاد یا خیر خیرات کے معنی میں محدود کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سورج کی کرنوں کو کسی ایک کوٹھری میں مقید اور محبوس کر دینے کی کوشش کرے اس بنا پر ہر وہ اقدام اور عمل جو کسی امرِ دنیوی سے متعلق ہو یا امرِ اخروی سے مگر ہو بہر حال قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق "سبیل اللہ" میں داخل اور اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن کی تعلیمات کی رو سے ایک مسلمان کی زندگی "حالتِ امن ہو یا حالتِ جنگ ایک جہاد ہے جس کو فلسفہ کی زبان میں تنازع للبقا کہتے ہیں۔ جنگ کی حالت میں یہ جہاد۔ حرب وضرب اور قتل وقتال کی شکل میں ظہور کرتا ہے اور حالتِ امن میں صنعت وحرفت۔ تجارت۔ علوم وفنون۔ اعلیٰ تعلیم وتربیت اور سائنس اور ٹکنالوجی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس بنا پر حالت جنگ میں جس طرح وہ فرض ہے اسی طرح حالتِ امن میں یہ ضروری ہے۔ دین وہ بھی ہے اور یہ بھی۔ ان میں تفریق کرنا دین اور دنیا میں تفریق کرنا ہے۔ اور اسلام کی طبیعت اور فطرت اس تفریق کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو فراموش کئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ اور درحقیقت مسلمانوں کے زوال کا اصل راز یہی ہے۔

جن لوگوں نے امریکہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وسیع وعریض ملک ۱۸۶۵ء تک ایک محض زراعتی ملک رہا لیکن اس کے بعد چند صنعت کار ——— (INDUSTRIALISTS) پیدا ہو گئے جن میں انڈریو کارنیج (ANDREW CARNEGIE) کا نام سرِفہرست ہونا چاہئے۔ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے پینتیس برس کے اندر اندر پورے ملک اور پوری قوم کا چہرہ بدل دیا۔ چنانچہ جو ملک ۱۸۶۵ء میں صرف ایک زراعتی ملک تھا وہ ۱۹۰۰ء میں صنعت وحرفت کا مرکز بن گیا اور اب وہ اس لائق تھا کہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

تجارت کے علاوہ دوسرا اہم ذریعۂ معاش فلاحت وزراعت ہے۔ قرآن مجید میں بیشتر آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات وانعامات شمار کراتے ہوئے زمین اور اس سے پیدا ہونیوالے اناج ترکاریاں۔ پھول اور پھلوں کا اور ساتھ ہی مویشیوں اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد ومنافع کا ذکر بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ سب چیزیں تمہارے لئے بطور رزق اور بطور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سامانِ راحت وزینت پیدا کی گئی ہیں۔ صحابہ کرام میں مہاجرین کا عام پیشہ تجارت تھا اور انصار کا زراعت۔ یہی وجہ ہے کہ مملکت میں نظم ونسق میں مہاجرین کا جو عمل دخل تھا وہ انصار کا نہیں ہوا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی سالانہ رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا ملک زراعت میں تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے اور دیہی آبادی کی آمدنی کا تناسب بھی کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ اتر پردیش کے مغربی اور مشرقی اضلاع میں میں متعدد مسلمانوں کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنی محنت اور سمجھ بوجھ سے اور جدید معلومات اور جدید آلات اور سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے فارموں اور باغوں کو غیر معمولی ترقی دی ہے اور دس بارہ برس کی مدت میں ہی لکھ پتی بن گئے ہیں۔ اور ان میں بعض اصحاب تو ایسے ہیں جو ہر سال اپنے ہاں کی غیر معمولی پیداوار کے باعث حکومت کی طرف سے انعام وصول کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق اور معیشت کے سینکڑوں نہیں، ہزاروں لاکھوں ذرائع اور وسائل پیدا کئے ہیں۔ دنیا کے سب لوگ ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پھر مسلمان کیوں نہ اٹھائیں اور ایک ملازمت پر ہی دھرنا جمائے بیٹھے رہیں۔ بقول اقبال

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

تعلیم سیاسیات اور معاشیات پر گفتگو ہو چکی۔ اب تعلیم کو لیجئے اس کے بعد سماجیات اور مذہب کی باری آئے گی۔ عالمِ موجودات پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں تین چیزیں نظر آتی ہیں (۱) خدا (۲) انسان اور (۳) کائنات۔ اور چونکہ ایک انسان کی زندگی کا تعلق تینوں سے ہے اس بنا پر ایک اچھی اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ان تینوں کا علم ہونا ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص تینوں کا علم تفصیلی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر جو معاشرہ ترقی یافتہ اور صالح ہوتا ہے وہ اپنے افراد کے لئے ایک ایسا نظامِ تعلیم مرتب کرتا ہے جس کے ماتحت ایک خاص منزل تک پہنچ کر مذکورہ بالا تینوں چیزوں سے ضروری اور کارآمد واقفیت ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو منزلیں آتی ہیں ان میں مضامین گھٹتے رہتے ہیں یہاں تک کہ آخر میں صرف ایک مضمون رہ جاتا ہے جس میں مہارت یا تخصص حاصل کیا جاتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم ہمارے زمانہ کا نہایت اہم موضوعِ بحث ہے۔ ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آئے دن اس پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا" کا عالم ہے۔ آج تک اس پر اتفاق نہیں ہو سکا کہ تعلیم کی تعریف اور اس کا مقصد کیا ہے؟ بہر حال ہمارے نزدیک تعلیم کی صحیح تعریف یہ ہے: TO KNOW SOMETHIHG ABOUT EVERYTHING AND EVERY - THIG ABOUT SOMTHING. یعنی تھوڑا بہت ہر ایک چیز کو جاننا اور کسی چیز کو مکمل طور پر جاننا۔ یہ مقولہ تعلیم پر کسی انگریزی کتاب میں عرصہ ہوا پڑھا تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ کس کتاب میں۔! اور یہ مقولہ تھا کس کا؟ غالباً یونان کے کسی حکیم کا تھا۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ اور جیسا کہ میں نے اپنے متعدد مضامین میں اور تقریروں میں ثابت کیا ہے مسلمانوں کے ہاں جو نظام تعلیم ان کے دور عروج و ترقی میں رائج رہا ہے وہ تعلیم کی اس تعریف کا صحیح مصداق تھا۔ چنانچہ انکے نصاب میں جہاں ایک طرف علوم دینیہ اور سماجی علوم (SOCIAL SCIENCES) شامل ہوئے تھے جن سے خدا اور انسان کا علم حاصل ہوتا تھا تو ساتھ ہی سائنس کے علوم بھی ہوتے تھے جن سے کائنات سے واقفیت ہوتی تھی۔ اس بنا پر۔ جیسا کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی معرکۃ آلارا کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں بڑی قوت سے لکھا اور ثابت کیا ہے مسلمانوں کے ہاں "تعلیم قدیم" اور "تعلیم جدید" کا فرق کبھی نہیں ہوا۔ لیکن جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ ان کی پالیسی اور مصلحت اور اس سے زیادہ علماء کا جمود اور وقت ناشناسی! تعلیم کی دو قسمیں قدیم و جدید ہو گئیں۔ اور ان کے حاملین میں وہی بُعد ہو گیا جو نئی اور پرانی چیزوں میں ہوتا ہے۔ اب انگریز کبھی کے چلے گئے لیکن تعلیم کی یہ دو قسمیں اب بھی چلی آرہی ہیں اور ایک سیکولر نظام میں (جہاں تک عام ملکی نظام کا تعلق ہے) ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے۔ اس بنا پر ہمیں دونوں قسموں پر الگ الگ گفتگو کرنی چاہئے۔ لیکن تعلیم قدیم یعنی عربی مدارس سے متعلق میرے متعدد مقالات اور بعض خطبات شائع ہو چکے ہیں اس لئے اس مجلس میں اسکے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک تعلیم جدید کا تعلق ہے مسلمانوں میں اصولاً دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

© rasailojaraid.com